

مرزا غالب کا تو فلسفہ ہی یہ ہے کہ دشمنی بھی ہر حال تعلق ہی کا ثبوت ہے۔  
وہ نفسِ ذکر پر خوش ہے، اس کے لیے اچھے بُرے کا سوال پہلے نہیں، بعد  
میں آتا ہے۔

۴۔ شرح : اے ناامیدی کے بے پناہ سیل! ذرا ختم جا۔ امید  
کا جو براے نام تسمہ لگا ہوا ہے، وہ بھی کٹ نہ جائے۔ اُسی کی بنا پر ہم رات  
دن سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اگرچہ اس سے حاصل کچھ نہیں ہوتا،  
لیکن ہماری دل لگی کا ایک ذریعہ ضرور ہے۔ اگر یہ سہارا بھی باقی نہ رہا اور  
امید کے پورے خانے پر اندھیرا چھا گیا تو اس کوشش میں دل لگی اور دلچسپی  
کا جو سامان ہے، وہ بھی ختم ہو جائے گا۔

انسان حصولِ مقصد کے لیے جو کوششیں کرتا ہے، وہ امید پر مبنی  
ہوتی ہیں، اگرچہ اس کی حیثیت کچھ ہی ہو۔ کوششیں کامیاب نہ بھی ہوں تو  
جب تک امید کا تھوڑا بہت سہارا باقی ہے، وہ جاری رہیں گی اور ان میں مصروفیت  
کے باعث انسان اک گونہ لذت محسوس کرے گا۔ اگر ناامیدی ایک طوفان کی طرح  
ہجوم کر کے آجائے تو ظاہر ہے کہ رہا سہا سہارا بھی ختم ہو جائے گا اور نتیجہ کامل  
مالوسی، نیز سعی و کوشش کے تعطل کے سوا کچھ نہ ہوگا۔

۵۔ شرح : ہم چلنے کی زحمت کیوں برداشت کریں۔ دامانگی اور  
بیچارگی کو ہمارے قدموں سے اس درجہ عشق ہو گیا ہے کہ جو بھی قدم رکھتے  
ہیں، وہ اٹھ نہیں سکتا۔

مطلب یہ کہ ہمارے لیے دامانگی کے باعث چلنا غیر ممکن ہے۔  
مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ ”منزل کے ساتھ“ میں ”استعمال ہو تو اس  
سے مراد“ راستہ“ ہوتا ہے، ”پر“ استعمال ہو تو منزلِ مقصود سمجھنا چاہیے۔

۶۔ شرح : محبوب عاشق سے کہتا ہے کہ تمہارا دل تو جہنم کی آگ  
بھڑکنے کا جلوہ دکھا رہا ہے۔ عاشق جواب دیتا ہے کہ جو کچھ آپ نے فرمایا،